Subject:	**Urdu**
Module:	**35**
Paper:	**GAZAL**
Topic:	**Nasir Qazmi**
Content writer:	**Prof.Khwaja Md Ekramuddin** **Jawaharlal Nehru University, New Delhi**
PI:	**Professor Mazhar Mehdi Hussain** **Jawaharlal Nehru University, New Delhi**

ناصر کاظمی

(1925-1972)

01.تعارف/تمہید (Introduction)

ناصرکاظمی 8 دسمبر 1925 کو انبالہ میں پیدا ہوئے اور 2 مارچ 1972 کو لاہور میں وفات پائی۔ ان کے والد محمد سلطان کاظمی، رائل انڈین آرمی میں صوبیدار میجر کے عہدے پر مامور تھے۔ ابتدائی تعلیم پیشاور میں پائی، انبالہ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ محکمہ سماجی بہبود میں لائیژاں آفیسر کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کیا۔ اسسٹنٹ پبلسٹی آفیسر بھی رہے۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے اسٹاف آرٹسٹ کے طور پر آخر عمر تک خدمت انجام دیتے رہے۔ مختلف اوقات میں اوراقِ نو' ہمایوں، خیال اور ہم لوگ کی ادارت بھی کی۔

ناصرکاظمی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک اعلیٰ جدید غزل گو شاعر تھے۔ آزادی کےبعد کی اردو غزل پر ان کے گہرے اثرات ہیں۔ اس اعتبار سے ناصر کاظمی کی غزل عہدساز و تاریخ ساز بھی کہلاتی ہے۔ انھوں نے کئی اعلیٰ درجے کی نظمیں بھی کہی ہیں۔ 'پہلی بارش' ایک طویل نظم ہے جو غزل کی ہیئت میں ہے اور ناصر کی غزل کے خاص اسلوب کا ہی عکس ہے۔ ناصر کاظمی نے 'سُر کی چھایا' نام کا ایک منظوم ڈرامہ بھی لکھا تھا۔ کئی ریڈیو فیچرز لکھے، اداریے اور مضامین لکھے۔ ولی، میر، نظیر اور انشا کے انتخاب تیار کیے۔ ناصرکاظمی نے ایک ڈائری بھی لکھی تھی جس نے ان کے ذہن، شعور اور حسّیت کو سمجھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

ناصر نے امریکن سنٹر لاہور کے زیراہتمام کنتھ کینتھ ایس لِن کی امریکن سوسائٹی کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کو اس طور پر ترتیب دیا جاسکتا ہے:

برگِ نے (غزلیں) 1952

دیوان (غزلیں) 1972

پہلی بارش (کئی غزلوں پر مشتمل نظم کا تجربہ) 1975

نشاطِ خواب (نظمیں) 1977

سُر کی چھایا (منظوم ڈرامہ) 1981

خشک چشمے کے کنارے (نثر) 1982

انتخاب میر 1989، انتخابِ نظیر 1990، انتخابِ ولی و انتخابِ انشا 1991، ناصر کاظمی کی ڈائری 1995

02. سبق کا مقصد(Learning Outcome)

ناصر کاظمی ایک جدید غزل گو شاعر ہیں۔ کلاسیکی غزل گو شعرا کے بارے میں تو ہمارے نقاد برابر لکھتے آئے ہیں، لیکن نئے شعرا پر بہت کم مواد دستیاب ہے۔ ناصر کاظمی بھی ایک نئے شاعر ہیں۔ ان کی غزل کئی اعتبار سے نئی اور عہد ساز کہلاتی ہے۔ اس سبق میں ان کی اُن شعری خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں ناصرکاظمی کی انفرادیت کا راز پوشیدہ ہے۔ طلبہ کی

سہولت کے لیے ہم نے درج ذیل عنوانات قائم کیے ہیں۔ جو طلبہ کے لیے یقیناً مفید مطلب ہوں گے:

(i) ناصر کاظمی کی معاصر غزل کے رجحانات
(ii) ناصر کاظمی کی غزل میں روایت کا عمل
(iii) میر کے لہجےکی بازیافت
(iv) ناصر کاظمی کا شہرِآتش بجاں

03. ناصر کاظمی کی معاصر غزل کے رجحانات

ناصرکاظمی 1925 میں پیدا ہوئے۔ گویا 1950 کے اردگرد وہ 25 برس کے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کا رخ نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد زوال کی سمت ہوگیا تھا۔ پچھلی نسلوں میں فراق کی آواز سب سے مختلف تھی جو ناصر سے 35 برس بڑے تھے۔ نصف صدی کے اس دورانیے میں مجروح اور فیض کی غزل ایک علیحٰدہ مذاق کی حامل تھی جو کئی اعتبار سے ماضی سے روشنی بھی اخذ کرتی ہے اور نئے محسوسات اور تجرباتِ زندگی کو لطیف پیرائے میں ادا بھی کرتی ہے۔ یہ غزل اپنے کلاسیکی رنگ و آہنگ، اور فکر و احساس کی دِل نشینی کے باعث بہت جلد اپنے قاری سے ایک جذباتی رشتہ قائم کرلیتی ہے۔ مجروح کا آہنگِ شعر بلند ہے اور فیض نے اونچے اور دھیمے سُر کو ایک خوش نما واحدے میں ڈھالنےکی سعی کی۔ یہ چیز فرا ق کے کلام میں زیادہ واضح ہے۔ فراق کسی ایک اسلوب کے شاعر نہیں ہیں اور کسی ایک اسلوب کو قائم رکھنے اور اسے فروغ دینے کی بھی انھوں نے کوشش نہیں کی۔ وہ پُرگو تھے اور اپنی پُرگوئی پر کوئی باندھ باندھنا نہیں چاہتے تھے اس لیے انھوں نے ایک مضمون کو

سو رنگوں میں باندھا اور اپنی ذات کے تجربے کو بھی زبان دیتے رہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں میر کے بعد فراق ہی ہیں جو پیکروں کی راہ سے محسوسات کو ادا کرتے ہیں۔ یہ پیکر بصری بھی ہیں لمسی بھی۔ اسی طرح عشق کے تجربات کو بھی انھوں نے نئے مفاہیم فراہم کیے۔ عاشق نہ تو روایتی عاشق ہے، نہ معشوق روایتی معشوق۔ نہ ہجر مکمل ہجر ہے اور نہ وصال مکمل وصال۔ انھی تجربات سے ناصر کاظمی نے بھی روشنی حاصل کی ہے۔ اس نوعیت کے فراق کے چند اشعار پیش ہیں، ان عشقیہ مضامین میں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے:

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تجھے رنجشِ بے جا بھی نہیں

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا ارادہ بھی نہیں

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ

گزر پھر بھی

فراق کے لہجے کی نرمی اور تجربے کی حساسیت نے ناصرکاظمی کی غزل کی روپ ریکھا بنانے میں خاص رول ادا کیا ہے۔ جب کہ فیض اور مجروح جیسے دو اہم ترقی پسند غزل گو شعر کی غزل تقسیم وطن کے ارد گرد زمانے میں اپنے لہجے کی شائستگی اور کلاسیکی رچاؤ کی وجہ سے نئے ذہنوں کے لیے غزل کا یک نیا معیار مہیا کررہی تھی۔ یہ سلسلہ احمد فراز اور افتخار عارف تک برقرار ہے۔ فیض ناصر کاظمی سے 14 برس اور مجروح 6 برس بڑے تھے۔ گویا مجروح اور ناصرکاظمی کی عمروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ لیکن یہ اتفاق ہے کہ فیض، مجروح اور ناصر کاظمی کی غزل گوئی کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ فیض، مجروح اور ناصر کاظمی کی شاعری کے پہلے مجموعےاور فیض کی دستِ صبا 52-53 میں شائع ہوئی۔ نقشِ فریادی ہی نہیں دستِ صبا کی غزلوں میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں، جن میں فراق کی گونج کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

مری خاموشیوں میں لرزاں ہے — میرے نالوں کی گمشدہ آواز

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کردے — گناہِ نظر کو حجاب آتا ہے

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی — ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

دستِ صبا میں کل 16غزلیں ہیں اور غزلوں کا یہ قلیل ترین سرمایہ ہی فیض کو ایک منفرد غزل گو کے درجے پر فائز کردیتا ہے۔ یہ محسوس تجربے کی شاعری ہے جس میں فیض نظم اور غزل دونوں میں ایک نئی توانائی کا احساس دلاتے ہیں۔ غالب کا آہنگِ شاعری بلند ہے، فیض نے غالب کے اس لہجے سے بہت فائدہ اٹھایا ہے:

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تسلی کہ دہر میں تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غالب اپنے حوصلوں کو ہمیشہ تازہ دم رکھتے ہیں۔ جذباتی پسپائی کا کہیں گلہ کرتے ہیں نہ حقائق سے فرار اختیار کرتے ہیں۔ سوگواری اور ناامیدی کو تو کبھی پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ فیض بھی ہمیشہ اپنی جرأت کو آزماتے ہیں، حوصلوں کی پرورش کرتے ہیں، دار و رسن کو ایک کھیل سمجھتے ہیں لیکن کہیں کہیں ان کے لہجے میں سوگواری کے آثار بھی نمودار ہوجاتے ہیں، لیکن یہ لمحاتی کیفیات ہمیشہ ان کی آواز پر محیط نہیں ہوتیں، فیض کا اصل لہجہ اور اصل آواز یہ ہے جس میں غالب و سوداکا رنگ پوری طرح گھُل مل گیا ہے:

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گفتگو آج سر کوئے بتاں

گریزاں ناصح ٹھہری ہے

ہاں کج کرو کُلاہ کہ سب کچھ لُٹا کے ہم اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

تم آرہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

فیض نے قدیم استعاروں اور تلمیحات کو نئے معنی دے کر غزل کے دامن کو وسیع کیا۔ ممتاز حسین نے یہ درست کہا ہے کہ:

’’فیض کی شاعری میں اگر ایک روایت قیس کی ہے تو دوسری منصور کی:

ہمیں سے سنّتِ منصور و قیس زندہ ہے

فیض نے ان دونوں روایات کو اپنی شاعری میں کچھ اس طرح سمو لیا ہے کہ ان کی شاعری بذاتِ خود ایک روایت بن گئی ہے۔ فیض کو ہم اسی روایت کی انفرادیت اور اسی نغمے کے بانکپن سے پہچانتے ہیں جس میں موجِ شفق، موجِ صبا اور موجِ خون گھُل مل گئی ہیں۔ فیض کی اس شاعری کا ہر حرف ایک آیت

ہے، ان مانوس تمنّاؤں اور خیالوں کا جن سے ہمارے سینے آباد ہیں۔'' (ادب اور شعور: ممتاز حسین، ص 304)

دراصل یہی وہ آواز ہے جس کی گونج مجروح کے یہاں بھی اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ فیض اور مجروح دونوں ترقی پسند تھے اور دونوں کی غزل میں ایک خاص قسم رعنائی اور طنطنہ نظر آتا ہے۔ دونوں اپنے عشق کی صعوبتوں پر نازاں اپنی کلاہ کج رکھتے ہیں۔ قدیم استعاروں کو دونوں نے نئی معنویت بخشی اور خیال کی ندرت کوبھی ملحوظ رکھا۔ مجروح کی غزل میں جو کلاسیکی رچاؤاور گہرالسانی شعور ہے، اس نے ایک طرف غزل کی روایت کی توسیع کی دوسرے ترقی پسند غزل کو ایک نشاطیہ آہنگ سے بھی سرفراز کیا۔ مثلاً:

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

دیکھ زنداں سے پرے رنگِ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

شبِ ظلب نرغۂ راہ زن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

اگر فیض اور مجروح یا جذبی اور سردار جعفری کی غزل کے مجموعی کردار کو سامنے رکھ کر ناصر کاظمی کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوجائے گا کہ ناصر کاظمی کی شاعری ڈوبتے ہوئے دلوں،اداسیوں سے بھرے لمحوں اور سوگوار جذبو ں کی شاعری ہے۔ جو خیال بھی پیش کرتی ہے تو اسے محسوسات کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرتی ہے۔

04. ناصرکاظمی کی غزل، میں روایت کا عمل

ہر صنف کی اپنی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں، غزل جیسی صنف، کا شمار ان اصناف میں کیا جاتا ہے جو کلاسیکی ہیں اور ہیئت و موضوع کی سطح پر جن کا اپنا نظام ہے۔ اگرچہ غزل محض اپنی ہیئت سے پہچانی جاتی ہے لیکن اس کے مضامین کی ایک روایت رہی ہے۔ ان مضامین کی تکرار سے موجودہ غزل کا دامن بھی خالی نہیں ہے۔ اسی طرح غزل میں ردیف و قافیے کے نظام کی بھی خاص اہمیت ہے۔ خاص طور پر قافیہ اس کے وجود کا ایک ایسا حصہ ہے، جس کے بغیر غزل کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے کلاسیکی شعرا نے غزل سے متعلق اس کی خارجی اور داخلی خصوصیات کو فارسی سے لیا اور ایسی ایسی مثالیں قائم کیں کہ 'بلند ی کا تصور' ہی غزل سے وابستہ ہوگیا۔ میر ہمارے سب سے پہلے غزل گو شاعر ہیں جنھیں ان کی غزل کی بنیاد پر ہی 'خدائے سخن' کہا جاتا ہے۔ میر کو ہم ان کلاسیکی شعرا میں شمار کرتے ہیں جنھوں نے غزل کی بنیادیں وضع کیں، غزل میں موجود تخلیقی وسعتوں اور تخلیقی امکانات کی طرف متوجہ کیا،غزل میں زبان کے برتنے کے طریقے کی عملی مثال قائم کی۔ غزل کو ایک ایسا منفرد اسلوب عطا کیا جو میر کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

میر سے قبل بھی غزل کی روایت ملتی ہے۔ ولی اور سراج نے قدیم (دکنی میں مستعمل) طرزِ سخن کے بجائے ایک ایسے طرزِ سخن کی بنیاد رکھی جس میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ صفائی و شفافیت تھی، فارسی مرکبات و تلمیحات کو سلیقے سے برتنے کا اسلوب تھا۔ سراج نے متصوفانہ رجحان کی نمائندگی کی اور متصوفانہ فکر اور متصوفانہ داخلی تجربے کو غزل میں کچھ اس طور سےپیش کیا کہ وہ آئندہ کے شعرا کے لیے ایک روایت بن گیا۔ اردو غزل میں تصوف کے علم نے

فلسفیانہ خیالات کے اظہار کے لیے راہ ہموار کردی۔ تصوف ہی کے توسط سے مضامینِ شعر میں غیرمعمولی وسعت پیدا ہوئی۔ انسان دوستی، وسیع المشربی،وارفتگی و سپردگی، ہجر و وصال، حسن و عشق جیسے مضامین کو شعرا نے بلیغ معنی عطا کیے۔

ولی نے جمالیاتی احسا س کی نمائندگی کی۔ ان کے یہاں بھی سرشاری و سرمستی کی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن اس سرشاری میں ارضی کیف و کم شامل ہے۔ متصوفانہ خیالات سے ولی کی غزل بھی آراستہ ہے لیکن وہ صوفی و صافی نہ تھے اسی متصوفانہ فکر پر ان کی غزل اپنی اساس رکھتی ہے جو فارسی سے ہوتی ہوئی حسن شوقی تک اور حسن شوقی سے ان تک پہنچی تھی۔ ولی درحقیقت قدیم و جدید کے مابین ایک پُل کا کام کرتے ہیں۔ ولی دکنی شاعری کا نقطۂ عروج ہیں اور ایک نئے دور کے بنیاد گر بھی۔ اسی لیے ولی کو عہد سازبھی کہا جاتا ہے۔ ولی ایک حسن پرست ہیں اور حسن کے مجازی تصور کو مثال بناتے ہیں جب کہ سراج حسن کے حقیقی اور مجرّد تصور کو مثال بناتے ہیں۔ بعدازاں شمالی ہند کے شاہ حاتم و آبرو سے لے کر میر اور غالب اور ان کے بعد ہمارے دور تک ان تصورات سے غزل کو روشنی ملتی رہی۔

ولی کا آہنگ نشاطیہ، سراج کا فکرانگیز، میر کا اداسی و سوگواری سے مملو، سودا، ناسخ اور غالب کے آہنگ میں بلندی و حوصلگی کے آثار ملتے ہیں۔ میر کےیہاں جو سادہ بیانی ملتی ہے وہ اپنے باطن میں اتنی سادہ نہیں ہوتی، اس میں بلیغ معنویت چھپی ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی ایک جدید غزل گو شاعر ہیں بلکہ احمد ندیم قاسمی کے لفظوں میں ''ناصرکاظمی محض ایک اچھا غزل گو ہی نہیں تھا، ایک عظیم غزل گو بھی تھا'' ناصر کی عظمت اس میں ہے کہ وہ روایت کے بہترین عناصر کو اپنے تخلیقی آب و رنگ کے ساتھ ایک نئی کیفیت میں بدل دیتے ہیں۔ روایت کو

محض روایت کے طور پر ناصر نے قبول نہیں کیا بلکہ اسے اپنے طرزِ احساس کے ساتھ متحد کرکے ایک ایسے معنی فراہم کیے جس میں روایت پیوند کی طرح اپنی آمیزش کا احساس نہیں دلاتی۔ ناصر کی غزل میں روایت کو اخذ کرنے کے اس اسلوب میں بھی ایک سلیقہ ہے جس کی طرف احمد ندیم قاسمی نے واضح اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ناصر کے پاس اظہار کا جو دلآویز سلیقہ تھا وہ جدید ہوتے ہوئے بھی غزل کی فضا سے ہم آہنگ تھا۔ ناصر کی جدّت غزل کی روایت ہی سے پھوٹی تھی۔''

درج ذیل اشعار میں ناصر نے بھی، وارداتِ عشق اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیات کو موضوع بنایا ہے۔ حسن و عشق کے معاملات و کیفیات سے اردو غزل کا دامن کبھی خالی نہیں رہا۔ ناصر نے انھیں کیا نیا رنگ و آہنگ دیا ہے، اس کی کچھ مثالیں پیش ہیں:

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

وہ تابِ درد وہ سودائے انتظار کہاں
اُنھیں کے ساتھ گئی طاقتِ شکیبائی

جدائیو ں کے مرحلے بھی حُسن سے تہی نہ تھے
کبھی کبھی تو شوق آئنے دکھا کر رہ گیا

کیا روئیں فریبِ آسماں کو
اپنا نہیں اعتبار کچھ دیر

تری نگاہ تغافل کو کون سمجھائے
کہ اپنے دل پہ مجھے اختیار بھی تو نہیں

ان اشعار میں ناصر نے سانحۂ محبت، انتظار و طاقتِ شکیبائی، جدائی، فریبِ آسماں، نگاہِ تغافل سے متعلق مضامین غزل کی روایت ہی سے اخذ کیے ہیں، لیکن ناصر نے انھیں بڑی سادگی اور مؤثر طریقے سے ادا کیا ہے۔ ناصر بہ ظاہر سادہ لفظوں میں گہرے اور بلیغ مفہوم بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اسی لیے احمد ندیم قاسمی کا یہ خیال درست ہے کہ: ناصر کاظمی کی غزل اس حقیقت کی ایک بلیغ مثال ہے کہ فن بہ ظاہر سادگی کے باوجود بلیغ آور مفہوم سے مملو ہوسکتا ہے۔

05 ۔میر کے لہجے کی بازیافت

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ناصر نے اردو غزل کی روایت کے بہترین عناصر سے اپنی غزل کو کچھ اس طرح آراستہ کیا کہ اسے ایک نئی روایت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس روایت میں میر کی اس سادہ بیانی کی روش کو کسب کرنے کی کوشش کا خاص دخل ہے جو ظاہر ہی میں سادگی کا تاثر دیتی ہے، اندر سے پیچیدہ ہے۔ میر کے تجرباتِ زندگی کا دائرہ وسیع تھا۔ انھوں نے زندگی کے بے شمار پیچ و خم دیکھے تھے، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دربدر کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ تلاشِ معاش اور سکونِ ذہن کے لیے انھیں طرح طرح کے پاپڑ بیلنے پڑے۔ وہ کبھی تھک ہار کر نہ بیٹھے اسی لیے ان کی غزل میں اکثر سوگواری کی فضا تو پیدا ہوجاتی ہے لیکن تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے ناصر کاظمی کے تجربات کا دائرہ اتنا وسیع ہے اور نہ انھیں معاش کے لیے تگ و دو کرنی پڑی۔ ناصر کے دور میں درباروں کی ملازمت و سرپرستی نہ سہی

ذرائع کا فقدان نہیں۔ ناصر کاظمی نے صبر و سکون کے ساتھ زندگی گزاری، لیکن کچھ اداسیاں اور سوگواریاں اس عہد کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ رشتوں میں پہلے جیسا تقدّس رہا نہ آدمی ایک دوسرے کے لیے بے لوث ہے۔ تنہائی موجودہ زندگی کا سب سےبڑا مسئلہ ہے۔ میر طرح ناصر کی رات بھی بہت لمبی ہے، ناصر کاظمی کی غزلوں میں آگ، دھواں، رات، زخم، ہجر، فراق، خوں، شام، شور، شہر، نگر وغیرہ سے متعلق مضامین میر کی شعری کائنات کی یاد دلاتے ہیں:

دھوپ اُدھر ڈھلتی تھی دل ڈوبتا جاتا تھا اِدھر
آج تک یاد ہے وہ شام جدائی مجھ کو

دل ترے بعد سوگیا ورنہ کیا کیا کچھ
شور تھا اس مکاں میں

کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے
گزر گئی جرسِ گُل اداس کرے مجھے

رنگ برسات نے بھرے کچھ تو
زخم دل کے ہوئے ہرے کچھ تو

دن ڈھلا رات پھر آگئی سو رہو سو رہو
منزلوں چھاگئی خامشی سو رہو سو رہو

کیسی آئی بہار اب کے برس
بوئے خوں ہے ایاغ میں

گُل کے

شہر در شہر گھر جلائے گئے یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

میر کا لہجہ سوگوار بھی ہےاور دھیما بھی۔ ناصر کے شعروں میں بھی ہم آہستہ آہستہ سلگنے کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں، دلسوزی و جاں سوزی کی وہ کیفیت جو ایک دم سینوں کو پھونک دیتی ہے شعر میں ڈھلنے کے بعد اس کی تاثیر دیر پا نہیں ہوتی۔ ناصر کے کلام میں بار بار جس سوزشِ دل اور جلن کا احساس ہوتا ہے اس میں قاری کو شریک کرنے کی غیرمعمولی قوت ہے۔ اونچی آواز دلوں پر محیط ہوسکتی ہے دلوں میں اُتر نہیں سکتی۔ ناصر کے محسوسات میں اسی لیے ان کی ذات کا تجربہ میر کے تجربے کی یاد دلاتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی بھی قسم کے لسانی تکلف و تصنع کو گوارہ نہیں کرتے۔ محسوسات کی زبان ہمیشہ لسانی تکلفات سے عاری ہوتی ہے۔ میر نے بھی عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے بجائے روزمرّہ کی زبان ہی کو ترجیح دی اور اسی چیز کو ناصر کاظمی نے ایک زندہ روایت کے طور پر اپنا لیا:

خواب میں رات ہم نے کیا دیکھا آنکھ کھلتے ہی چاند سا دیکھا

گھر کے آنگن میں آدھی آدھی رات مِل کے باہم کہانیاں کہنا

پھر چمکنے لگیں سونی ساربانوں کی صدا پھر

راہیں آئی

کیسا سنسان ہے سحر کا سماں
پتیاں محوِ یاس، گھاس اداس

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں مُنہ اندھیرے

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سن

06. ناصرکاظمی کا شہرِ آتش بجاں

ایک شہر میر کا تھا جو بار بار لُٹتا تھا باربار بستا تھا۔ بسی بسائی بستیوں کے خاک ہوجانے میں دیر نہیں لگتی لیکن کسی شہر کے اُجڑنے کے بعد اسے آباد کرنے، اس کی گزشتہ رونقوں کو دوبارہ زندہ کرنے، اس کے باسیوں کے حواس درست ہونے، اس کے رگ و ریشے میں زندگی کے نشے کو سرایت کرنے میں ایک مدت درکا رہوتی ہے۔ میر کا دلّی کیا برباد ہوا، دل کا شیش محل چکنا چور ہوگیا۔ میر کے کلام میں بار بار آگ، شور، خون، نالہ و فغاں، چیخ، گلی وغیرہ سے جو پیکر بنے ہیں اس کی بنیاد میں ان کا باصراتی اور ذاتی تجربہ شامل ہے۔ تقسیم وطن کا سانحہ بھی ناصرکاظمی کےلیے ایک شہر زندہ کی موت کے مماثل ہے۔ انھوں نے کہیں ملال کیا ہے، کہیں اداس ہوئے ہیں، کہیں تاسف کا اظہار کیا ہے، کہیں یہ کیفیتیں ماضی کی یادوں کی کسک کے

ساتھ وارد ہوتی ہیں۔ ناصر کے نوحے میں گہرا داخلی کرب اور احساس زیاں ہے۔ یادِرفتگاں اس کی سب سےبڑی رفیق و ہمدم ہے۔ انتظار حسین نے ناصر کے اداس لمحوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ رات رات بھر شہر کی بے داغ گلیوں میں اداس اداس پھرتا، شعر کہتا اور منہ اندھیرے چڑیوں سے باتیں کرتا'' گویا ایک ہولناک سناٹا ناصر کے رگ و پَے میں اتر گیا تھا۔ ناصر کی نئی غزل نے اس ہولناک سناٹے کو خوں رنگ لفظوں میں ڈھال دیا ہے۔ انتظار حسین کہتے ہیں:

''فسادات، ہجرت اور ایک نئے ملک کی پیدائش کے ہنگام، نئے ناصر کاظمی نے جنم لیا۔ نئے ناصرکاظمی کے ساتھ وہ نئی غزل پیدا ہوئی جس نے عہد کی اس عظیم واردات کو ایک تخلیقی درد میں منتقل کیا۔ اس راستے ناصر کی غزل ایک نئے طرز احساس کی نقیب ہے۔''

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
اور کچھ دن پھرو اُداس اُداس

سفرِ منزلِ شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا روگ

سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ

ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اُداس

وہی پرانی باتیں اُس کی وہی پرانا روگ

کسے دیکھیں کہاں دیکھا نہ جائے

وہ دیکھا ہے جہاں دیکھا نہ جائے

کہیں آگ اور کہیں لاشوں کے انبار

بس اے دورِ زماں دیکھا نہ جائے

پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں

چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

شہر اُجڑے تو کیا، ہے کشادہ زمینِ خدا

اِک نیا گھر بنائیں گے ہم صبر کر صبر کر

دل ویراں میں دوستوں کی یاد

جیسے جنگو ہوں داغ میں گُل کے

ناصر کی شاعری کیا ہے، یادوں کا ایک سلگتا ہوا نگار خانہ ہے۔ جس کے سارے ایوان جھُلسے ہوئے، در و دیوار خوں چشیدہ، صحن و آنگن چیخوں اور فریادوں سے معمور۔ کہیں کوئی حسین یاد اس کے ذہن میں ایک لچک سی پیدا کردیتی ہے اور ایک پل کے لیے ڈھارس سی بندھ جاتی ہے لیکن وہ پل محض ایک پل ہی ہوتا ہے۔ پھر وہی ناسٹلجیا، یادِ ماضی کی کسک جو آتش خاموش کی مانند اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی ہے۔ ناصر کاظمی کی شاید ہی کوئی ایسی غزل ہو جس میں انھوں نے اپنا یاد نگر نہ بسایا ہو۔ کہیں یہ کسک ایک چیخ میں ڈھل گئی ہے کہیں ایک نغمہ بن گئی ہے۔ ناصرکاظمی کی درج ذیل غزل اس کی ایک خوبصورت ترین مثال ہے۔

ناصر کے بعد کی غزل نے اسی سے نئے آداب سیکھے، نیا لہجہ سیکھا، نئے آہنگ کی تشکیل کی:

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں ک کے لیے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لیے
جِس دھوپ کی دِل میں ٹھنڈک تھی وہ دھوپ اُسی کے ساتھ گئی
ان جلتی بُجھتی گلیوں میں اب خاک اُڑاؤں کس کے لیے
و ہ شہر میں تھا تو اُس کے لیے اوروں سے بھی مِلنا پڑتا تھا
اب ایسے ویسے لوگوں کے میں ناز اٹھاؤں کس کے لیے
اب شہر میں اُس کا بدل ہی نہیں کوئی ویسا جانِ غزل ہی نہیں
ایوانِ غزل میں لفظوں کے گُلدان سجاؤں کس کے لیے
مُدّت سے کوئی آیا نہ گیا سنسان پڑی ہے گھر کی فضا
اِن خالی کمروں میں ناصر اب شمع جلاؤں کس کے لیے

(کلیات ناصر کاظمی،دیوان 104)

07.خلاصہ(Summary)

- ناصرکاظمی کی شاعری ایک نئے طرزِ احساس کی مظہر ہے۔ انھوں نے روایت کے بہترین عناصر سے بھی روشنی حاصل کی اور نئے عہد کے کرب او ربے چینی کو بھی غزل کی گفتار میں شامل کیا۔ ناصر کے لہجے کی اُداسی میں میر کی اداسی کا رنگ شامل ہے۔ ناصر کاظمی کی بسی بسائی بستیوں کا اجڑنا میر کی دلّی کے اُجڑنے سے مماثل ہے۔ میر کا وہ ذاتی تجربہ تھا ناصر کا یہ ذاتی تجربہ ہے۔ ناصر کی یادوں کے نگار خانے آتش زدہ ہیں۔ تقسیم وطن کیا ہوئی دل بھی تقسیم ہوگئے، شہر کے شہر سنسان ویرانوں میں بدل گئے۔ انسانی زندگیوں کی کوئی حُرمت رہی نہ انسانی رشتوں کے کوئی معنی رہے۔ یہی احساسِ زیاں ناصر کاظمی کی غزل میں شدید صورت اختیار کرلیتا ہے۔ ان کی غزلوں میں ہم ایک سلگاؤ کی کیفیت محسوس کرتے ہیں جس میں سوزش ہے، جلن ہے اور یہی سوزش کبھی چیخ میں ڈھل جاتی ہے اور کبھی ایک جاں سوز نغمہ بن جاتی ہے۔ شیلی کے لفظوں میں یہ شاعری Saddest Thoughts سوگ وار خیالوں کی شاعری ہے جس میں سوز بھی ہے ساز بھی، جسے سننے والے کی دھڑکن بننے میں دیر نہیں لگتی۔
- ناصرکاظمی نے نئی غزل کو دھیمے سُر میں بات کرنے کے آداب سکھائے۔
- نئی غزل کا آغازناصر کاظمی سے ہوتا ہے۔
- ناصرکاظمی کی غزل نے روایت سے بھی بہت کچھ سیکھا اور بدلے میں روایت کو ثروت مند بھی کیا۔
- ناصرکاظمی نے میر کے لہجے کی بازیافت کی۔
- میر کی دلّیِ مرحوم ناصرکاظمی کے اجڑے ہوئے شہر وں سے ملتی جلتی ہے۔

- ناصرکاظمی نے اپنی اداسیوں کو نغمہ بنا دیا۔
- ناصرکاظمی نے میر کی طرح بڑی اور چھوٹی دونوں طرح کی بحروں کامیابی کے ساتھ آزمایا۔
- ناصرکاظمی ایک منفرد اسلوب کے شاعر ہیں جنھیں ہم محسوسات کا شاعر کہہ سکتے ہیں۔

11. (الف) موضوعی (Subjective)سوالات

(i) ناصرکاظمی نے میر سے کیا اثر قبول کیا؟

(ii) ناصرکاظمی کی معاصر غزل کے رجحانات کا جائزہ لیجیے۔

(iii) ناصرکاظمی نے روایت سے کس قسم کے اثرات قبول کیے؟

(iv) ناصرکاظمی کے شہر کو شہرِ آتش بجاں کیوں کہا گیا؟

(ب) معروضی (Objective) سوالات: (صحیح کی نشاندہی کیجیے):

(i) سُر کی چھایا کیا ہے؟

(الف) منظوم ڈرامہ (ب) رزمیہ

(ج) نظموں کا مجموعہ (د) غزلوں کا مجموعہ

(ii) قدیم استعاروں کو کس نے نئی معنویت بخشی؟

(الف) جوش (ب) فیض

(ج) فانی (د) حسرت

(iii) متصوفانہ رجحان کو کس نے غزل کی روایت کا ایک اٹوٹ حصّہ بنا دیا؟

(الف) میرتقی میر (ب) ولی

(ج) سراج اورنگ آبادی (د) سودا

(iv) ناصرکاظمی کے پہلے مجموعے کا نام کیا ہے؟

(الف) آیاتِ وجدانی (ب) نشاطِ خواب

(ج) پہلی بارش (د) برگِ نَے

(ج) صحیح /غلط (True/False) کی نشاندہی کیجیے

(i) ناصرکاظمی نے نئی غزل کا تصور دیا۔ (صحیح/غلط)

(ii) ناصرکاظمی نے روایت کو سختی کے ساتھ رد کیا۔ (صحیح/غلط)

(iii) 'پہلی بارش' ناصر کاظمی کی طویل نظم ہے۔ (صحیح/غلط)

(iv) ناصر کاظمی کی غزل میں آواز کا سُر اونچا ہے۔ (صحیح/غلط)

(د) خالی جگہو ں کو پر کیجیے(Fill in the blanks)

(i) ناصرکاظمی کی غزل عہد ساز و تاریخ..... کہلاتی ہے۔

(ii) فیض اور مجروح دونوں..... ہیں۔

(iii) تقسیمِ وطن کا سانحہ ناصرکاظمی کے لیے ایک شہرِ زندہ کے لیے ..... کے مماثل ہے۔

(iv) نئی غزل کا..... ناصرکاظمی سے ہوتا ہے۔

10۔ (الف) اہم بنیادی الفاظ کے معانی (Glossary)

عہد ساز	عہد کو بنانے والا
وضع کرنا	بنانا
تاریخ ساز	تاریخ کو بنانے والا
فائز کرنا	مامور کرنا
نُدرت	انوکھاپن

★ (ب) موضوع سے متعلق نیٹ پر مواد دستیاب نہیں ہے۔

11 (ج) موضوع سے متعلق ضروری،حوالہ جاتی کتابوں کی فہرست

- شعرشور انگیز (جلد اوّل) شمس الرحمن فاروقی
- برگِ نے (طبعِ اوّل) ناصرکاظمی
- کلیاتِ ناصر ناصرکاظمی
- ادب و شعور ممتاز حسین

12 ۔ معروضی سوالات کے جوابوں کی نشاندہی

(i)الف (ii) ب (iii) ج (iv) د

13 ۔ صحیح،غلط کی نشاندہی

(i) صحیح (ii) غلط (iii) صحیح (iv) غلط

14 ۔ خالی جگہوں میں پُر کیے جانے والے الفاظ کی نشاندہی

(i) ساز (ii) ترقی پسند (iii) موت (iv) آغاز

O